رسائل و مسائل

(۱) کیا معاشی وجوہ سے منعِ حمل صحیح ہے؟

(۲) کیا حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت موجودہ انسان جیسی تھی؟

سوال: عرض یہ ہے کہ میں اپنے ایک عزیز کے دو اعتراضات کا جواب تسلی بخش طور پر نہ دے سکا۔ ازراہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ اعتراضات یہ ہیں:-

۱- "مولانا نے قرآن مجید کی آیت: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۳۱) کی تفسیر میں انصاف سے کام نہیں لیا اور اِس آیت کی تفسیر میں اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لحاظ سے مفہوم نکالا ہے۔ کیونکہ آیت میں قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور قتل اُسی کو کیا جا سکتا ہے جس میں جان ہو، جب کہ جان اس جرثومے میں اُسی وقت پڑتی ہے جب رحمِ مادر میں دو مخالف جرثوموں کا ملاپ واقع ہوتا ہے اور ایک جاندار شے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ افزائشِ نسل کو روکنے کے طریقے عام طور پر مذکورہ ملاپ سے پہلے ہی عمل میں آجاتے ہیں لہٰذا اُس چیز کا قتل کیا معنی جس کا وجود یا جاندار ہی نہ ہو۔"

۲- "ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مخالفین نے اِس نظریہ کی مخالفت محض اس تصور اور عقیدے کی بنا پر کی ہے کہ انسان آدمؑ کی اولاد ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ درست سہی، لیکن آپ کے پاس اس بات کو جاننے کا کونسا مستند ذریعہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت و بناوٹ وہی رہی ہوگی جو کہ موجودہ انسان کی ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جس شکل میں پیدا کیا ہو وہ ڈارون کے نظریہ کے مطابق ہی ہو (یعنی اُس وقت کا انسان UNI - CELLULAR ہو)، صرف فرق اتنا ہی ہو کہ آپ سے آپ وجود میں نہ آیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا ہو اور بتدریج

ترقی کرتا ہوا موجودہ انسان کی شکل کو پہنچا ہو۔"

جواب:۔ آپ نے اپنے عزیز کے جو اعتراضات پیش کیے ہیں اُن کا جواب درج ذیل ہے:

۱ - آپ کے عزیز نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۱ کو بغور نہیں پڑھا بلکہ جو خیالات اُن کے ذہن میں پہلے سے جمے ہوئے تھے اُنہی کی بُنیاد پر آیت سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اِس میں صرف قتلِ اَولاد سے منع کیا گیا ہے۔ حالانکہ اِس آیت میں قتلِ اولاد کو بڑی خطا قرار دینے کے ساتھ اُس کے مُحرّک، یعنی خوفِ افلاس کو بھی غلط قرار دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی یہ الفاظ کہہ کر کہ "ہم اُنہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی"، اِس امر کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ خوفِ افلاس، جو قتلِ اَولاد کا مُحرّک بنتا ہے، دراصل خدا کی رزّاقی پر عدمِ اعتماد ہے، ورنہ یہ اعتماد موجود ہو تو نہ افلاس کا خوف تمہیں لاحق ہوگا اور نہ تم اولاد کو قتل کرو گے۔ اِسی بات کی تشریح میں نے اپنے حاشیے میں کی ہے جس پر غور کرنے کی زحمت آپ کے اِن عزیز نے نہیں اُٹھائی۔ اُس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ حمل کو روکنا قتلِ اَولاد ہے، بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ جو خوفِ افلاس پہلے قتلِ اَولاد اور اسقاطِ حمل کا محرّک ہوتا تھا وہی اب ضبطِ ولادت کی تحریک کا محرّک بنا ہوا ہے، اس لیے معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائشِ نسل کا سلسلہ روک دینا بھی اِس آیت کی رُو سے غلط ہے۔

۲ - آپ کے عزیز مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں کہ وہ قرآن سے زیادہ ڈارون کے معتقد ہیں اِسی وجہ سے انہوں نے تخلیقِ آدم کے متعلق قرآن کے تمام بیانات کو نظر انداز کر کے ڈارون کی رائے کے مطابق حضرت آدمؑ کا وَاحِدُ الْخَلِیَّہ سَالِمَہ (UNI-CELLULAR MOLECULE) ہونا (ازراہِ مہربانی صحیح قرار دینے سے احتراز کرتے ہوئے صرف) "ممکن" ٹھہرایا ہے، اور مجھ سے سوال کیا ہے کہ آخر تمہارے پاس یہ جاننے کا کونسا مستند ذریعہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے جسم کی ساخت ویسی ہی تھی جیسی موجودہ انسان کی ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ اگر صاحبِ موصوف کے نزدیک قرآن مجید علم کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے تو اُن سے بحث لاحاصل ہے، کیونکہ محض عقلی حیثیت سے آدمؑ کے جسم کی ساخت کا موجودہ انسان کی ساخت جیسا ہونا بھی اُسی طرح "ممکن" ہے جس طرح اُس کا واحدُ الخلیہ سالمہ ہونا "ممکن" ہے۔ امکان میں جب دونوں برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی "مستند ذریعۂ علم" نہیں ہے تو خواہ مخواہ بحث میں کیوں وقت ضائع کیا جائے؟ لیکن اگر وہ قرآن کو

علم کا مستند ذریعہ مانتے ہوں تو تھوڑی سی زحمت اٹھا کر سورۂ بقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹، سورۂ اعراف، آیات ۱۱ تا ۲۵، سورۂ حجر، آیات ۲۶ تا ۴۲، سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۶۱ تا ۶۵، اور سورۂ طٰہٰ، آیات ۱۱۵ تا ۱۲۳ بغور پڑھیں اور ڈارون کے نظریے کو نگاہ میں رکھ کر پڑھیں۔ کیا اُن کی عقل یہ تصوّر کر سکتی ہے کہ قرآن کی اِن آیات میں جو کچھ حضرت آدمؑ کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ ایک واحِدُ الخَلِیَّہ سلسلے پر راست آتا ہے؟

اِس کے ساتھ میں ایک بات اور بھی آپ کے عزیز سے کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر وہ قرآن کو علم کا مستند ذریعہ نہ سمجھتے ہوں تو اُن کی اپنے ضمیر اور اپنے اخلاق اور اپنے معاشرے کے ساتھ اِس سے بڑی کوئی بے انصافی نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کریں۔ ایک راستباز انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ سچے دل سے تو اسلام کا قائل نہ ہو مگر اِس کا صاف صاف اظہار و اقرار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل رکھ کر مسلسل فریب دہی کا ارتکاب کرتا رہے۔

کیا کافر عملِ صالح پر اجر کا مستحق ہے؟

سوال: ۔ گذارش ہے کہ اس بندۂ عاجز کے ایک مخلص دوست جو دینی خیال کے آدمی ہیں، اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو شخص بھی اپنے رب کی رضا کے لیے کوئی نیک عمل کرے، مثلاً مظلوم کی حمایت، غریب کی امداد، مسافر کی خدمت، کسی بیمار کی تیمار داری، تو وہ اپنے رب کے ہاں ضرور اجر پائے گا۔ آخرت کی اجارہ داری مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں۔ اللہ رب العالمین ہے صرف مسلمانوں کا خدا نہیں۔ ان کا گمان ہے کہ ہر مذہب کا پیرو مثلاً عیسائی، ہندو، بُدھ وغیرہ، اگر خالص نیت سے نیکی کرے، یعنی ریاکاری مقصود نہ ہو تو وہ آخرت میں جزا پائے گا۔ میں ان سے متفق نہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیتا ہوں کہ ایمان لانا بھی قبولیت عمل کے واسطے شرط ہے۔ مثلاً سورۂ نحل، ۹۷۔ سورہ طٰہٰ، ۱۱۲، سورۂ انبیاء، ۹۴۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ میں نے ان سے عرض کیا تمام علماء اِس بات پر متفق ہیں۔ انہوں نے جواب دیا علما عموماً انتہا پسند ہیں۔ پھر وہ آپ کے متعلق کہنے لگے کہ مولانا مودودی صاحب متوازن ذہن کے عالم ہیں اور ان کی سوچ انتہا پسندانہ نہیں۔ آپ اس مسئلہ کا فیصلہ ان سے پوچھ دیجیے چنانچہ

یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ وضاحت کے لیے ایک اور بات لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر ایک فاسق مسلمان نیکی کرے تو وہ قبول، اور وہی نیکی یا اس سے بہتر نیکی اگر ایک غیر مسلم کرے تو وہ مسترد۔ اللہ ایسا جانبدار نہیں ہوسکتا یہ اس کی شانِ بندہ پروری کے خلاف ہے۔

جواب: آپ کے دوست اگر اس مسئلے کا جواب قرآن سے چاہتے ہیں تو وہ اس باب میں بالکل صریح ہے کہ کافر کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے، وہ محض اپنے کفر کی بنا پر عذابِ جہنم کا مستحق ہے۔ آپ نے سورۂ نحل، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ انبیاء کی جو آیات اُن کو سُنائی ہیں وہ اگر انہیں مطمئن نہیں کرسکیں تو اُن سے زیادہ صریح اور مفصل آیات قرآن میں موجود ہیں جو پوری وضاحت کے ساتھ یہ بتاتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کی آیات اور روزِ آخرت پر یا ان میں سے کسی ایک پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں اور آخرت میں ان کے لیے جہنّم کا عذاب ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء آیات ۱۵۰ - ۱۵۱ ملاحظہ فرمائیے جن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کُفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور (کفر و ایمان کے) بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکّے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے"۔

اس ارشاد کی رُو سے خدا اور رسولوں کو نہ ماننا، یا خدا کو ماننا اور رسولوں کو نہ ماننا، یا رسولوں میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا، اِن میں سے ہر ایک قطعی کُفر ہے اور کُفر کی سزا (عمل سے قطعِ نظر) رسوا کُن عذاب ہے۔

پھر سورۂ انعام، آیت ۱۳۰ دیکھیے۔ اُس سے پہلے کی آیات میں شیاطین اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے لیے ہمیشگی کے عذاب کا فیصلہ سُنانے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ جنّ و انس

سے خطاب کر کے فرمائے گا:

اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا ۔ وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ ۔

"کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول خود تم میں سے جو سناتے تھے تم کو میری آیات اور ڈراتے تھے تم کو یہ دن دیکھنے سے ؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں ۔ اُن کو دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا اور انہوں نے آخر کار خود اپنے اوپر گواہی دی کہ ہم کافر تھے"۔

یہاں رسولوں کی بات نہ ماننے اور اُن کی پیش کردہ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہ لانے اور آخرت کو تسلیم نہ کرنے والے لوگوں کو کافر قرار دیا گیا ہے اور اُنہی کو ہمیشگی کے عذابِ جہنّم کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے، بلا لحاظ اِس کے کہ اُن کے عمل کیسے تھے اور کیسے نہ تھے ۔

یہی بات سورۂ زُمر آیات ۷۱، ۷۲ میں فرمائی گئی ہے ۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ جب کافر جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے تو اُن کے لیے جہنّم کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اُس کے کارندے (فرشتے) ان سے پوچھیں گے:

اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ۔ قَالُوْا بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۔

"کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس رسول خود تم میں سے جو سناتے تھے تم کو تمہارے رب کی آیات اور ڈراتے تھے تم کو یہ دن دیکھنے سے ؟ وہ کہیں گے ہاں، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چسپاں ہو گیا ۔ کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے"۔

یہاں بھی اُن لوگوں کو کافر قرار دیا گیا ہے جنہوں نے دُنیا میں رسولوں اور ان کی پیش کردہ آیات، اور آخرت پر ایمان لانے سے انکار کیا تھا ۔ انہی لوگوں کے حق میں ہمیشگی کے عذابِ جہنّم کا فیصلہ سُنایا گیا ہے ۔ اِس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ کفر کے سوا اُن کے کچھ اور گناہ تھے یا نہ تھے جن کی بنا پر وہ عذابِ جہنّم کے مستحق ہوتے یا نہ ہوتے ۔

اس کے بعد سورۂ ملک کی آیات ۸ تا ۱۱ دیکھیے جس میں صرف انبیاء اور اُن پر نازل ہونے والی کتابوں کے انکار کو عذابِ جہنّم کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۔ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۔

"جب بھی کوئی انبوہ اُس میں (یعنی جہنّم میں) ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے کیا کوئی خبردار کرنے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں، ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا، مگر ہم نے جھٹلایا اور کہا کہ خدا نے کچھ نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔"

اِن آیات کو دیکھنے کے بعد کیا کوئی شخص جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو، یہ ماننے سے انکار کر سکتا ہے کہ کُفر بجائے خود انسان کے جہنّمی ہونے کا مستقل سبب ہے، اور کُفر کے ساتھ کوئی نیک عملی بھی اُس کو جہنّم سے نہیں بچا سکتی؟ البتہ فرق اگر ہے تو صرف اِس لحاظ سے ہے کہ اُس دار العذاب کے دروازے بہت سے ہیں۔ اچھے کام کرنے والا کافر کسی اور دروازہ سے داخل ہوگا اور بُرے کام کرنے والے کفار اپنے بُرے اعمال کے مطابق مختلف دروازوں سے داخل ہوں گے۔ بالفاظ دیگر کسی کے لیے عذاب ہلکا ہوگا اور کسی کے لیے سخت اور کسی کے لیے سخت سے سخت۔ اعمال صرف عذاب کے خفیف یا شدید ہونے کے موجب تو بن سکتے ہیں، لیکن جہنّم میں جانے سے کوئی کافر نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ کفر خدا سے بغاوت ہے، اور باغی کے لیے اللہ نے اپنی جنت نہیں بنائی ہے۔

رہے مومن تو وہ دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ایمان کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی صالح ہوں۔ ان کے اگر کچھ قصور ہوں بھی تو وہ توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں، دُنیا کے مصائب، امراض، تکالیف بھی اُن کا کفّارہ بن سکتی ہیں، شفاعت بھی ان کے حق میں نافع ہو سکتی ہے، اور اللہ اپنے فضل و کرم سے بھی اُن کی مغفرت فرما سکتا ہے۔ دوسری قسم کے مومن وہ ہیں جو ایمان رکھنے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں۔ وہ باغی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ان کے لیے اگر کوئی چیز بھی بخشش کی موجب نہ بن سکتی ہو، تو اُنہیں بغاوت کی نہیں بلکہ جرم یا جرائم کی سزا دی جائے گی۔ دُنیا کے قوانین بھی باغی

اور مجرم کو ایک سطح پر نہیں رکھتے۔ پھر آپ احکم الحاکمین سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں کو ایک سطح پر رکھے گا؟

شہداء کی حیاتِ برزخ

سوال:۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۵۴ حاشیہ ۱۵۵ تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۲۶ میں، اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مُردہ نہ کہنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے رُوحِ جہاد سرد پڑتی ہے۔ اِسی نوٹ میں آگے چل کر یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ انہیں مُردہ کہنا حقیقتِ واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ لیکن پورے نوٹ کو پڑھنے سے پہلے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رُوحِ جہاد کے سرد نہ ہونے کی غرض سے انہیں مُردہ نہ کہنا چاہیے۔

۲۔ سورۃ 'المومن' آیت ۴۱ - ۵۷ تک کا ترجمہ جلد دوم میں صفحہ ۲۸۳ سے ۲۸۷ تک چلتا ہے۔ قرآن کا متن جو تفہیم القرآن میں شائع ہوا ہے اس میں صفحہ ۲۸۷ پر یُسَارِعُوْنَ کا لفظ آتا ہے، لیکن اس کا ترجمہ صفحہ ۲۸۳ پر ہی کر دیا گیا ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ چونکہ اصل لفظ اور ترجمہ میں چار صفحات کا فاصلہ ہے اس لیے پڑھنے والے کا ذہن اُلجھ جاتا ہے۔

۳۔ سورۂ یٰسٓ آیت ۲۶، حاشیہ ۲۳ تفہیم القرآن جلد چہارم میں مردِ مومن کی شہادت کے بعد اس کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے نوٹ میں کہا گیا ہے کہ حیاتِ برزخ کو ثابت کرنے والی آیات میں سے یہ آیت بھی ایک ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عالمِ برزخ میں رُوح جسم کے بغیر زندہ رہتی ہے، کلام کرتی ہے اور کلام سُنتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے، اور اہلِ دُنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اس پر اکثر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس مقام میں تو ایک شہید کی حالت کا ذکر ہے اور شہید کی زندگی بعد موت کا ذکر قرآن میں سورۃ البقرہ آیت ۱۵۴ اور دیگر مقامات میں بھی ہے۔ لیکن تفہیم کے اس حاشیے میں ایک شہید کے حالات کو بھی عام وفات یافتہ انسانوں پر کیوں منطبق کیا گیا ہے؟

جواب: سورۂ بقرہ آیت ۱۵۴ کے جس نوٹ کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے اس میں "مُردہ نہ کہو" کی

جو توجیہ میں نے کی ہے اس سے مقصود حیاتِ شہداء و صالحین کے متعلق لوگوں کے اِس خیال کی اصلاح ہے کہ وہ زندہ اِس معنی میں ہیں کہ ہماری دُعائیں سُنتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مُردہ کہنے سے جس بنا پر روکا ہے اور ان کی حیات کا اثبات کیا ہے وہ کفار و منافقین کی اُن باتوں کو رد کرنے کے لیے ہے جو وہ لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا اور لَوْ اَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا کہہ کہہ کر اہلِ ایمان میں بزدلی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ورنہ خود قرآن ہی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ شہادت جسمانی موت تو ضرور ہے (وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ اِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ) مگر حقیقت میں یہ حیاتِ جاوداں ہے (بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ)۔ اسی معنی میں میں نے بھی انہیں مُردہ کہنے کو حقیقتِ واقعہ کے خلاف قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے لیے حیاتِ بَرْزَخ اور حیاتِ اُخروی ثابت ہے۔

سورۂ مومنون کی آیات ۵۰ تا ۶۱ کے ترجمے میں آپ نے جس تقدیم و تاخیر کی طرف توجہ دلائی ہے، اس کے متعلق بعد کے ایڈیشنوں میں حاشیہ ۵۰ الف لکھ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اُردو زبان کی رعایت سے آیت ۶۱ کا ترجمہ پہلے کر دیا گیا ہے اور آیات ۵۰ تا ۶۰ کا ترجمہ بعد میں درج کیا گیا ہے۔

سورۂ یٰسٓ کے حاشیہ ۲۳ کو اگر آپ سورۂ بقرہ کے حاشیہ ۱۵۵ اور سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۹ کے ساتھ پڑھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شہداء کی حیات اصل میں برزخی حیات ہی ہے، ورنہ جسم و رُوح کی علیحدگی کے اعتبار سے جس طرح دوسرے لوگوں پر موت وارد ہوتی ہے اُسی طرح شہداء پر بھی وارد ہوتی ہے۔ اِسی لیے ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیوہ کا نکاح ثانی جائز ہے لیکن ان کو مُردہ کہنے سے جس بنا پر منع کیا گیا ہے وہ اُوپر میں بیان کر چکا ہوں۔

ایک صریح جھوٹ

سوال:۔ کراچی سے شائع ہونے والے ایک ادبی ماہنامہ "افکار" دسمبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں ریاض صدیقی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "قائدِ اعظم۔ ایک عہد ساز شخصیت" شائع ہوا ہے۔ اِس مضمون کی آخری سطور میں صاحبِ مضمون نے 'جماعت اسلامی اور قائدِ اعظم' کے ذیلی عنوان سے لکھا ہے:

"قائدِ اعظم نے ۱۹۳۹ء میں راجہ صاحب محمود آباد اور قمر الدین کو اختیار دیا تھا کہ وہ مولانا مودودی

اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دیں۔ مسلم لیگ کا جلسہ ہونے والا تھا۔ قمرالدین نے اس مسئلے پر مولانا مودودی سے رابطہ قائم کیا۔ مودودی نے مسلم لیگ کے جلسہ میں شرکت اس شرط پر منظور کی کہ قائداعظم اپنے دستخطوں سے ان کے نام دعوت نامہ جاری کریں۔ اس وقت تک مسلم لیگ میں رسمی دعوت ناموں کے اجرا کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ تاہم قمرالدین فوراً دہلی گئے اور کسی نہ کسی طرح مطلوبہ دعوت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مولانا مودودی دعوت نامہ کے باوجود مسلم لیگ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے اور قدرے تلخی کے ساتھ معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی نام نہاد جماعت سے تعلق قائم کرنا پسند نہیں کرتا جو اسلام کی نمائندہ جماعت نہ ہو۔ مسلم لیگ میں شرکت کرنے والے محض نام کے مسلمان ہیں اور میں اس بے معنی سیاسی ہنگامے سے متعلق ہو کر اپنی شخصیت کو کھونا نہیں چاہتا۔" (افکار۔ کراچی شمارہ دسمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۲/۲۳)

ایک ایسا شخص جو آپ کے فکر اسلامی اور تحریک اسلامی سے متاثر ہو کر آپ کی شخصیت سے دلی تعلق رکھتا ہے اور آپ کے افکار اور شخصیت پر اپنے طور پر قلمی کام بھی کر رہا ہے استدعا کرتا ہے کہ ان امور کی وضاحت کر کے ممنون فرمائیں:

۱۔ کیا واقعی ایسا دعوت نامہ طلب کیا گیا؟

۲۔ کیا مذکورہ دعوت نامہ مہیا کر دیا گیا؟

۳۔ دعوت نامہ مہیا ہونے کی صورت میں کیا واقعی تلخی کے ساتھ معذرت کا اظہار کیا گیا؟

جواب: آپ کے مفصل سوال کا نہایت مختصر جواب یہ ہے کہ ماہنامہ افکار کراچی کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے اس کا ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس جرأت کے ساتھ جھوٹ لکھتے اور اسے پھیلاتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کوئی آخرت بھی ہے جہاں جا کر انہیں اپنی ان افترا پردازیوں کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

کیا حنفیوں کے مقدمات کا کسی دوسری فقہ پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟

سوال: اگر حنفی اور شافعی نقطۂ نظر کے درمیان اختلاف ہو تو کیا یہ ضروری ہے کہ حنفیوں کے معاملے میں صرف حنفی نقطۂ نظر ہی قبول کیا جائے؟ اور خاص کر جہاں عدالت اس رائے پر پہنچے کہ شافعی نقطۂ نظر زیادہ وزن دار ہے؟

جواب: اس سوال کے دو پہلو ہیں۔ ایک اصولی، دوسرا عملی۔

اصولی حیثیت سے اگر قاضی کسی مسئلے کی تحقیق کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ اس خاص مسئلے میں حنفی مذہب کی بہ نسبت شافعی یا مالکی یا حنبلی مذہب کے دلائل کتاب و سنت کی رو سے زیادہ مضبوط ہیں تو وہ نہ صرف اُس کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے بلکہ راجح مذہب کو چھوڑ کر مرجوح مذہب پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن عملی حیثیت سے اس میں چند در چند مشکلات ہیں۔

اوّل تو ہمارے ملک میں دوسرے مذاہب کی مبسوط کتابیں نہیں ملتیں جن سے اُن کے دلائل پوری طرح معلوم کیے جا سکیں اور ایک مسئلے سے تعلق رکھنے والے تمام وہ جزئیات سامنے آجائیں جنہیں کسی دوسرے مذہب کے مطابق فیصلہ کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ احادیث اور اُن کی شرحوں اور اسماء الرجال کا پورا ذخیرہ کسی عدالت کی لائبریری یا کسی پبلک لائبریری یا کسی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود نہیں ہے تاکہ ایک مذہب کی فقہی کتابیں جن روایات کے حوالے دیتی ہیں ان کے درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصل مآخذ سے رجوع کیا جا سکے۔

تیسری مشکل یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تمام کتابیں عربی زبان میں ہیں اور ہمارے ملک کے حکامِ عدالت اور وکلاء خواہ وہ عربی زبان سے بحیثیت زبان بخوبی واقف بھی ہوں، اُنہوں نے اُس خاص زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے جو فقہ، اصول فقہ، حدیث اور اصولِ حدیث میں استعمال ہوتی ہے۔ ان مضامین کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے محض عربی زبان کا علم کافی نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے لا کالجوں میں اسلامی قانون کی کماحقہ تعلیم کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔

آخری مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی عدالتِ عالیہ تحقیق کا حق ادا کر کے حنفی مذہب کے بجائے کسی دوسرے مذہب کے مطابق فیصلہ کر دے تو یہ ماتحت عدالتوں کے لیے ایک اصولی نظیر بن جائے گی اور اجتہادی اہلیت کے بغیر دوسرے مذاہبِ فقہ کے مطابق فیصلے کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔ ہمارے ملک کی عام آبادی حنفی ہے، اور یہاں کے علماء اسی مذہب سے واقف ہیں، بلکہ اس مذہب کی پیروی کے سخت پابند ہیں، اس لیے نیم پختہ علم کی بنا پر جب چھوٹی عدالتوں سے حنفی فقہ کے خلاف فیصلے صادر ہونے لگیں گے تو اس پر ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

ان تمام باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے میں یہ مشورہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

غرق ہونے والے فرعون کی لاش

سوال: - اگر تھوڑی سی فراغت ہو تو از راہِ کرم اَلْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ (یونس، آیت ۹۲) کے سلسلے میں میری ایک دو اُلجھنیں دُور فرمائیے۔ علامہ جوہری طنطاوی مصری اِس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ بحیرۂ احمر میں ڈوبنے والے فرعون کی لاش ۱۹۰۰ء میں مل گئی تھی اور مُفتّش نے کئی شواہد کی بنا پر اعلان کیا تھا کہ یہ لاش اُسی فرعون کی ہے۔ لیکن علامہ نے اُن شواہد کا ذکر نہیں کیا۔ آپ نے صرف ایک شہادت یعنی سمندری نمک کا ذکر فرمایا ہے جو فرعون کے بدن پہ پایا گیا تھا۔

اگر آپ کو باقی شہادتوں کا علم ہو، یا کوئی ایسی کتاب معلوم ہو جس میں اِن شواہد کا ذکر ہو تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں۔

آپ نے فرعون کے جسم پر سمندری نمک کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا اُس کی ممی حنوط شدہ نہیں تھی؟ اگر تھی تو سمندری نمک کیسے باقی رہ گیا تھا؟

کیا یہ نعش کسی ہَرم سے ملی تھی یا معمولی قبر سے؟ اور یہ مقام کہاں ہے؟ قاہرہ سے کس طرف ہے اور کتنا دُور ہے؟

جواب: - غرق شدہ فرعون کے بارے میں زیادہ تر معلومات مجھے LOUIS GOLPING کے سفرنامے IN THE STEPS OF MOSES THE LAWGIVER سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس نے اپنے اِس تحقیقاتی سفرنامے میں لکھا ہے کہ فرعون رعمسیس دوم دراصل وہ فرعون تھا جس کے زمانے میں حضرت موسٰی علیہ السّلام پیدا ہوئے تھے اور بنی اسرائیل پر جس کے مَظالم مشہور و معروف ہیں۔ اسی لیے اس کو PHARAOH OF THE PERSECUTION کہا جاتا ہے۔ اور جس فرعون کے زمانے میں حضرت موسٰی علیہ السّلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اور جو بحرِ احمر میں غرق ہوا وہ رعمسیس کا بیٹا MENEPTAH تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کا نام MERNEPTAH لکھا گیا ہے)۔

گولڈنگ کی کتاب اور برٹانیکا کے مضمون EGYPT دونوں میں لکھا ہے کہ تھیبس THEBES میں اُس کے MORTUARY TEMPLE سے ایک ستون ۱۸۹۶ء میں FLINDERS PETRIC کو ملا تھا جس پر اُس نے اپنے عہد کے کارنامے گنائے تھے۔ اُسی ستون میں پہلی مرتبہ مصر میں اسرائیل کے وجود

کی تاریخی شہادت ملی - برٹانیکا کے مضمون MUMMY میں ذکر ہے کہ ۱۹۰۶ء میں انگریز ماہر علم التشریح SIR GRAFTON ELLIOT SMITH نے ممیوں کو کھول کھول کر ان کے حنوط کی تحقیق شروع کی تھی اور ۴۴ ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا - گولڈنگ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں اسمتھ کو منیٹہ کی لاش ملی جس کی پٹیاں جب کھولی گئیں تو سب حاضرین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس کے جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی - گولڈنگ مزید یہ بات بھی بیان کرتا ہے کہ یہ فرعون بُحَیراتِ مُرّہ (BITTER LAKES) میں غرق ہوا تھا جو اُس زمانے میں بحر احمر سے ملی ہوئی تھیں - آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ جبلِ فرعون کہتے ہیں - اُس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں نہایت گرم پانی کا چشمہ ہے جسے لوگ حمام فرعون کہتے ہیں اور سینہ بسینہ منتقل ہونے والی روایات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ فرعون کی لاش ملی تھی -

میں ان معلومات سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بُحَیراتِ مُرّہ میں ڈوبنے کے بعد اُس کی لاش کے پھول کر سطح سمندر پر تیرنے اور حمام فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا جس کے دوران میں اُس کے گوشت پوست میں سمندری پانی کا نمک جذب ہو گیا ہوگا - یہ نمک اُس کی لاش کو حنوط کرتے وقت خارج نہیں کیا جا سکتا تھا - تین ہزار برس کے دوران میں یہ رفتہ رفتہ اس کے جسم سے خارج ہو کر ایک تہ کی صورت میں جم گیا اور جب پٹیاں کھولی گئیں تو نمک اُس پر جما ہوا پایا گیا -